Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

عمر خان اعوان
اسکالر، پی ایچ ڈی اردو، نمل اسلام آباد
ڈاکٹر صائمہ نذیر
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو، نمل اسلام آباد

اردو نظم میں مبہم گوئی کا آغاز و رجحان

Umar Khan Awan ,
Scholar PhD Urdu , NUML Islamabad.
Dr. Saima Nazir ,
Assistant Professor Urdu, NUML Islamabad

The Beginning And Trend Of Vagueness In Urdu Poetry

In this research paper, an attempt has been made to understand the beginnings of ambiguity in modern Urdu poetry and to understand it as a phenomenon. The ambiguous narrative of the modern poem has been debated in the literary world for decades. In the movement of linguistic formations that started in the sixties, an attempt was made to express a new poetic expression by completely deviating from the tradition. The intellectual and stylistic changes in poetry during this period gave rise to serious problems of ambiguity in modern poetry. The movement of linguistic formations died out within a few years after its failure, but the trend of ambiguity in poetry continued. Therefore, the trend of vagueness has been studied under the intellectual degeneration in the contemporary situation. In this regard, the impact of European literary trends and modern socio-linguistic ideas on Urdu poetry has also been examined.

Keywords: of ambiguity, sixties, modern poetry, linguistic, degeneration

کلیدی الفاظ: جدید اردو نظم، ابہام، مغربی افکار، ڈسٹوپیا، یوتوپیا، فیض احمد فیض، مجید امجد، مبہم گوئی، ترسیل، ابلاغ

جدید اردو نظم کے سمجھ نہ آنے کا گلہ کئی دہائیوں سے کیا جا رہا ہے۔ قابل غور پہلو یہ ہے کہ نظم میں موجود ابہام کے گلہ مند محض عام قارئین ہی نہیں بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی اکثریت بھی گاہے گاہے اس مسئلہ کو نشان زد کرتی رہتی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ جدید نظم کا حوالے آتے ہی ذہن میں ایک ایسے تخلیقی متن کا خیال ابھرنے لگتا ہے کہ جو کسی پہیلی کی صورت میں ہو گا اور ہمیں اس سے بہت دیر تک الجھ کر معنی تک پہنچنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔ اس صورتحال میں بطور محقق ذہن میں اولین سوال یہی ابھرتا ہے کہ ن۔م۔ راشد، مجید امجد، فیض احمد فیض، ساحر لودھیانوی، اختر الایمان کے یہاں پل بڑھ کر اردو شاعری میں مقبول عام ہو جانے والی صنف، آخر مبہم گوئی کی منزل تک کیونکر پہنچ گئی؟ اس سوال کی تلاش میں نظم کے ارتقا کی جانب بڑھنے سے پہلے ابہام کے معنی کا تعین ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ ابہام اس لفظ کے معنوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے ابہام کے معنی 'گول مول بات کرنے، عدم وضاحت، معنی یا مفہوم میں اشتباہ اور گھم پن' کے ہیں۔ ابہام بطور ادبی اصطلاح متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک طبقہ اسے عجزِ کلام گردانتا ہے جبکہ دوسرا اسے کلام کی خوبی مانتا ہے اور یہیں سے ایک نا ختم ہونے والی بحث کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔

ابوالاعجاز حفیظ صدّیقی کے مطابق:

سعی ابلاغ کی ناکامی کو ادبی اصطلاح میں ابہام کہا جاتا ہے اور مبہم کے معنی ہیں (وہ جملہ، شعر، نظم یا عبارت) جس میں ابہام پایا جائے جو ابہام کا شکار ہو۔ شاعر یا ادیب ایک خاص بات (اپنا مافی الضمیر) قارئین یا سامعین تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ الفاظ سے کام لیتا ہے۔ اگر اس کے فراہم کردہ الفاظ قاری یا سامع تک ان خاص معنوں کے ابلاغ میں کامیاب نہ ہو سکیں تو کہا جائے گا کہ شعر یا عبارت میں ابہام ہے [۱]

اس تعریف کے مطابق ابہام ایک سقم ہے اور یہ معنی کی ترسیل اور ابلاغ میں ناکامی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی اس تعریف میں ابہام کا بنیادی مفہوم لغوی ہی رہتا ہے جبکہ کچھ نقادوں کے یہاں اس کے برعکس، بطور ادبی اصطلاح ابہام سے مراد کلام میں کثرتِ معنی کی موجودگی ہے۔ چنانچہ ابہام کی اس تعریف کی رو سے یہ عیب کلام نہیں بلکہ حسنِ کلام بن جاتا ہے۔

فرہنگ ادبی اصلاحات میں ولیم ایمسن کے حوالے سے ابہام کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے کہ

ایہام؛ ذو معنی بات، WILLIM EPSON نے اس موضوع پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے SEVEN TYPES OF AMBIGUITY اکثر بے احتیاطی کی وجہ سے ایک معنی کی جگہ دو یا تین معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ AMBIGUITY کا یہ مفہوم نہیں بلکہ شعر میں زبان کی گہرائی اور لطافت کی طرف اشارہ ہے جس میں لفظوں کا ہلکا شائبہ یا باریک فرق بھی ایک شعر سے مختلف ردعمل کا باعث ہوتا ہے۔ [۲]

یہاں ہم پر یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ ابہام کی تعریف میں آنے والی یہ تبدیلی مغربی ادب کے اثرات کے تحت ہے۔ انگریزی ادب کی اصطلاح Ambiguity کے لیے ابہام کا لفظ مستعار تو لے لیا گیا لیکن ابہام کے لغوی معنوں میں دو معنویت کے معنی نہ ہونے سے یہ معاملہ خود بھی مبہم ہو گیا ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ ایک طبقہ ابہام کی موجودگی کو حسنِ کلام مانتا ہے کیونکہ اس کی مراد کلام میں کثرتِ معنی سے ہے جبکہ دوسرا طبقہ اسے عیب جانتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں ابہام سے مراد ترسیل معنی کی ناکامی ہے۔

جدید اردو نظم میں ابہام کی صورتحال کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے یہ وضاحت ضروری ہے کہ نظم پر لگنے والے مبہم گوئی کے الزامات سے مراد ہمیشہ معنی کی عدم ترسیل رہی ہے۔ چنانچہ یہ بحث کثرت معنی کی ہے ہی نہیں بلکہ شاعر کے معنیِ مراد تک قاری کے نہ پہنچ سکنے کی ہے۔ اس مقام پر بھی یہ بحث ایک بار پھر دوراہے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابہام کس کی جانب ہے؟ قاری کی جانب یا لکھاری کی جانب؟ ابہام کا رخ قاری کی جانب ہونے سے مراد یہ ہے کہ معنی کی عدم ترسیل کا مسئلہ کلام میں نہیں بلکہ قاری اپنی کم علمی یا شاعر سے ذہنی، تجرباتی یا فکری ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث کلام کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جبکہ ابہام کا رخ لکھاری کی جانب ہونے سے مراد یہ ہے وہ ترسیل معنی میں ناکام ہو گیا ہے۔ مبہم گوئی کے رجحان سے وابستہ نظم نگاروں کی جانب سے یہ معاملہ کثرت سے اپنے حق میں استعمال کیا جاتا کہ دراصل ابہام ان کے کلام میں نہیں بلکہ قاری بدلی ہوئی عصری صورتحال میں ادب میں آنے والی ناگزیر تبدیلیوں کو اب تک قبول نہیں کر پایا اور نظم کو روایتی انداز ہی میں سمجھنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے نظم اس پر نہیں کھل پاتی۔

ابہام بعض صورتوں میں ذہنوں کی عدم مطابقت کا نتیجہ بھی ہے۔ فنکار اور قاری کے ذہنوں کی عدم مطابقت! فنکار کسی مخصوص معاشرہ کا ساختہ اور پرداختہ ہے وہ ایک مخصوص سطح اور زاویہ سے مسائل کا جائزہ لیتا اور تخلیقِ فن کرتا ہے۔ قاری کا معاشرہ کچھ اور ہے۔ اُس کے مسائل کچھ اور ہیں۔ اس کے تجربات کچھ اور ہیں اس کا زاویہ نگاہ اور سطح بھی بدلی ہوئی ہے۔ فنکار نے بات وضاحت اور تفصیل سے کہی ہے لیکن چونکہ قاری کی دنیا اور ہے اس لئے وہ فن پارہ کی روح تک پہنچنے میں ناکام ہے۔ اس کو دھواں دھواں سا محسوس ہوتا ہے وہ معنی کی تہہ تک نہیں پہنچتا اور تخلیق پر ابہام کا الزام عائد کرتا ہے۔ [۳]

قاری اور لکھاری میں مختلف سطحوں پر عدم مطابقت سے ابہام کا پیدا ہونا ایک قدرتی عمل ہے اور یہ بات عمومی طور پر درست بھی ہے تاہم یہ معاملہ چند فن پاروں یا کسی مخصوص لکھاری کا نہیں ہے بلکہ ایک صنف میں گزشتہ کئی دہائیوں میں تخلیق ہونے والے فن پاروں کی اکثریت کا ہے چنانچہ یہاں اس عمومی کلیے کو ڈھال نہیں بنایا جا سکتا۔

اردو نظم میں مبہم گوئی کی صورتحال کا بہتر طور پر اندازہ لینے کے لیے ہمیں اپنے والین سوال کی جانب رجوع کرنا ہو گا۔ جدید نظم بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب میں متعارف ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں مختلف تحاریک سرگرم تھیں۔ ادب میں اجتماعیت اور کلیت پسندی کا رجحان تھا۔ شاعری میں مقصدیت کا عنصر نمایاں تھا۔ چنانچہ جدید اردو نظم نے اس دور کے مزاج کو بھرپور انداز میں اپنے دامن میں سمیٹ کر یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ صنف محض داخلیت پسندانہ خیالات کے اظہار کے لیے نہیں جیسا کہ بعد ازاں اس سے یہی مراد لی جانے لگی۔

قیام پاکستان سے قبل کی صورتحال کا جائزہ لیں تو ہمیں سماج یوٹیوپیائی خیالات سے سرشار نظر آتا ہے۔ آزادی، معاشی مساوات، خوش حالی کے خواب سے شاعری کا دامن بھر رہا تھا تاہم قیام پاکستان کے بعد صورتحال یکسر بدل گئی۔آزادی خون میں رنگی ہوئی تھی۔ نئی ریاست کے نئے مسائل تھے، دوسری طرف ترقی پسند تحریک بھی زوال آمادہ تھی۔ شاعری میں ڈسٹوپک خیالات کا اظہار ہونے لگا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیض کے اس شعر میں موجود کیفیت کا اثر قیام پاکستان کے بعد کی نظموں میں نظر آتا ہے۔اس ضمن میں راشد کی نظم 'نمرود کی خدائی'، سباویران، فیض کی نظم' شورش بربت نے' ضیا جالندھری کی نظمیں یہ بہار اور خود فریبی سمیت کئی شعرا کی نظمیں حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

ڈسٹوپیائی خیالات کا دائرۂ اثر موجود پر تنقید اور بیزاری کے اظہار تک محدود رہتا ہے۔ایک متبادل نظریۂ زندگی فراہم نہ کرنے کی وجہ سے ان کا اظہار تادیر ممکن نہیں چنانچہ اردو نظم میں بھی یہ روش بھی چند سال جاری رہنے کے بعد ختم ہوگئی۔ یہی وہ دور تھا جب ہمارے یہاں مغربی افکار اور ادبی خیالات متعارف ہونا شروع ہوئے۔خطے میں آنے والی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں تو اذہان کو پہلے ہی متاثر کر رہی تھیں ایسے میں مغربی افکار کی یلغار نے اضمحلال میں مبتلا سماج کی نفسیات پر گہرا اثر کیا۔اس تمام تر صورتحال کے زیر اثر ساٹھ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی نئی نسل کے یہاں نظریہ ادب یکسر بدل چکا تھا۔ نئی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں روایت سے انحراف، پرانے پیرائیہ اظہار سے لاتعلقی کا اظہار، شعری لسانی پیکر کی تشکیلِ نو تشکیک وغیرہ میں مغربی خیالات کی گونج کو صاف طور سنا جا سکتا ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں لسانی تشکیلات کی تحریک بنیادی طور پر ایک ایسی نسل کا ادبی تجربہ تھا جو مذہب، سماج، علوم، نظریات وعقائد کی بنیادیں ہلنے کا براہ راست مشاہدہ کر رہی تھی۔ان کے نزدیک روح عصر کا تقاضا یہی تھا کہ روایت کو تج کر نیا پیکرِ اظہار تشکیل دیا جائے جو ان کے عہد کی ترجمانی کر سکے۔خارج پر بے یقینی پیدا ہونے سے داخلیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا اور اردو نظم میں اختلالِ تلازمہ کے تجربات اور شخصی علامات کی کثرت نے اردو نظم کی فضا کو ملگجا دیا۔ نئے شعری پیرائیۂ اظہار میں تمثال کاری کو بڑی اہمیت دی گئی۔اور نئی شاعری میں اسی شعری ٹول کے ذریعے کیفیت اور تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

شاعر جن باطنی حقائق کی متھ کی آفرینش اور بازآفرینی کر رہا ہے اس عمل میں امیج اس کا سب سے بڑا رفیق ہے۔ ہر دور کی شاعری میں امیج کا کوئی نہ کوئی تصور ملتا ہے لیکن ۱۹۵۸ء سے بعد کی شاعری میں اس کی تالیف و تعمیر کا قرینہ بدل گیا ہے۔اس قرینے پر انفرادی شعور اور تخلیقی عہد کی مہر ثبت ہے۔ نیا شاعر نئے زاویوں کی تخلیق و تعمیر اور قدیم ادبی حرمتوں اور بصارتوں میں ترمیم اور تخریب کے جس چوراہے پر کھڑا ہے اس کی پیچیدگی کا چہرہ مہرہ اس کے امیجز میں ملتا ہے۔ (۴)

ساٹھ کی دہائی کے شعرا نے اس بات کا ادراک تو بخوبی کر لیا تھا کہ روایتی طریق پر چلنے کا وقت گزر چکا ہے۔نئے عہد کے تقاضا یکسر بدل چکے ہیں۔آج کے عہد کے شاعر کو کسی نئی فکری نظام کے تحت زندگی کے سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہوگا لیکن یہ فکری نظام کیا ہو سکتا ہے اس کا جواب آج بھی نادارد ہے۔ چنانچہ نئی نظم کی تحریک تشکیک اور تشویش اور غم وغصے جیسی کیفیات کے اظہار سے آگے نہ بڑھ سکی۔ نظم میں معنوی سطح پر پیدا ہونے والے اتھلے پن پر پردہ ڈالنے کے لیے ابہام کا سہارا لیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ نظم پر دانستہ ابہام آفرینی کے الزامات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ادب میں شعوری طور پر ابہام پیدا کرنے کی روش کو جائز سمجھنے والے نقادوں نے بھی نئی نظم کے مبہم پن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ابہام کو کبھی کبھی ناگزیر سمجھتا ہوں اور ایک مستند فنی ضرورت بھی میں اصولی طور پر مگر جدید شاعری کا ابہام تو خالی سیپی ہے۔ معنی کے سمندر نے انھیں ساحل پر پٹک دیا ہے، اور اب ان کا مصرف صرف یہ ہے کہ ان سے بچے کھیلیں یا دنی درجے کے صناع اور دست کار کھلونے یا ہار اور بندے بنالیں۔ (۵)

ادب میں داخل ہونے والے چند مغربی خیالات بھی اردو نظم میں مبہم گوئی کے رجحان کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ان میں سب سے اہم ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز اور ولیم ایمپسن کے خیالات ہیں جن کی بنیاد پر نئی تنقید کا دبستان قائم ہوا۔ادبی فن پاروں کے تجزیے میں شاعر، مصنف کی ذات کو منہا کرنے سے معنیٔ مراد کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی اور متن میں موجود ابہام کے مطالعے کی بنا پڑی۔

لسانی تشکیلات کی تحریک کے فکری خیالات اور ان کے اٹھائے گئے سوالات کی اہمیت اپنی جگہ مگر تحریک کے زیر اثر جو ادب منظر عام پر آیا اسی قارئین اور ادبی دنیا میں پزیرائی نہ مل سکی چنانچہ یہ تحریک چند ہی سالوں میں ختم ہوگئی۔

لسانی تشکیلات کے مابعد منظر نامے پر ابھرنے والے نظم نگاروں کے سامنے بھی وہی صورتحال تھی۔ موضوعات کی بہتات تھی مگر زندگی کو دیکھنے کے لیے کوئی مربوط فکری نظام موجود نہ تھا۔ سوال یہ تھا شاعری میں وہ گہرائی کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے جو اردو شاعری کا ہمیشہ سے خاصا رہی ہے۔ ہمارے سماج میں شاعر کا مقام محض ایک فنکار کا نہیں رہا بلکہ اسے دانشور سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرافٹ کی شاعری کو کبھی وہ اہمیت نہیں مل سکی جو فکری عمق اور معنی وسعت رکھنے والی شاعری کو ملتی رہی ہے۔ عصری صورتحال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے اندھیروں میں کسی متبادل فکری نظام کا چراغ جلتا نظر نہیں آتا۔ ایسے میں شاعری سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ لسانی تشکیلات کے مابعد کے شعرا نے اپنے پیش روؤں کے بیشتر ادبی مغالطوں کو ترک کر دیا۔ ان کے ناکام تجربات سے سیکھتے ہوئے روایت سے ایک بار پھر رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ زبان کے خود ساختہ نظریات پر چلنے کی بجائے اسے ایک سماجی اور تاریخی عمل کے طور پر لیا البتہ نئے شعری پیرایئے کی تشکیل ضروری سمجھی۔ کسی قدر اظہار اور ابلاغ کی ذمہ داری کو بھی قبول کیا لیکن ان کی مشکل بھی یہی تھی کہ ان کے پاس بھی کوئی فکری نظام نہیں تھا۔ چنانچہ ساٹھ کی دہائی کے مابعد کا شاعر بھی تشکیک، تشویش، اضمحلال، شکست وریخت، داخلیت پسندی وغیرہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ساٹھ کے بعد کی نظم کا شاعر ایک متفکر انسان کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جسے پارہ پارہ ہوتی زندگی۔ بکھرتے ہوئے سماجی رشتوں، عقائد پر عدم اطمینان، مہابیانیوں کے زوال، مقصد حیات کے نامعلوم ہو جانے کا دکھ تو ہے لیکن اس کے پاس انہیں نئے معنی عطا کرنے اور زندگی کو پھر سے کسی فلسفیانہ خیال کے تحت مجتمع کرنے کا یارا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی تشکیلات کے بعد کی نظم بھی زیادہ تر شخصی علامات اور تمثال کاری ہی کو ذریعہ اظہار بناتی ہے اور معنی کو روپوش کرتے ہوئے کیفیات اور تاثرات کے اظہار کو ترجیح دیتی ہے۔ دانستہ ابہام آفرینی بعد کے نظم نگاروں کے یہاں بھی کثرتِ معنی کا وسیلہ نہیں بنتی بلکہ نظم کے اسلوب کو پیچیدہ کرنے کا باعث بنتی ہے۔

جدید شاعری کے ابہام کو میں نے مصنوعی کہا۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ میں کئی جدید شاعروں کے یہاں کر چکا ہوں۔ ان میں یہ حال ہے کہ پہلے ایک سیدھی سادی نظم کہہ لیتے ہیں پھر اس اوپر سے ابہام چھڑکنے کی کوشش کرتے ہیں(۶)

یہ گمان کیا جاتا ہے کہ نظم اگر قاری پر کھل گئی تو اس کی اہمیت ایک اعلیٰ ادبی فن پارے کی نہیں رہ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ جدید اردو نظم میں ملفوف اور مبہم انداز میں بات کہنے کا جواز کیا ہے؟ نظموں کے خانۂ معنی پر پڑے ابہام کے سیاہ پردے ہٹا دیے جائیں تو ان سے کیا برآمد ہوتا ہے؟ کیا مبہم گوئی کی روش سے اس پیچیدہ عہد کی ترجمانی ہوتی ہے یا یہ محض فرار کی ایک راہ ہے؟

حوالہ جات

(1) ابوالاعجاز حفیظ صدّیقی، ادبی اصلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵، ص ۱۵

(2) کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶، ص ۹

(3) سلیمان اطہر جاوید، ادب میں ابہام اور اس کے مسائل، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۴، ص ۲۲

(4) انیس ناگی، نئی شاعری اور ایچ (مضمون)، مشمولہ: نئی شاعری، مرتبہ: افتخار جالب، نئی مطبوعات، لاہور ۱۹۶۶، ص ۷۶۔۷۷

(5) سلیم احمد، ابہام اور بازی گری، (مضمون) مشمولہ: مضامینِ سلیم احمد، مرتبہ جمال پانی پتی، اکیڈمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹، ص ۲۴۹

(6) سلیم احمد، ابہام اور بازی گری، (مضمون) مشمولہ: مضامینِ سلیم احمد، مرتبہ جمال پانی پتی، اکیڈمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹، ص ۲۴۹